تخلیقِ انسان۔ سائنس اور قرآن

Creation of man, Quran and Science

Muhammad sharif
Principal, Govt.Associate College Jandanwala, Bhakkar, Punjab, Pakistan
gc.boys.jandanwala@gmail.com

Hafiz Muhammad Azhar Usama
Lecturer, Department of Islamic Studies, the University of Lahore, Lahore, Pakistan
muhammad.azhar@ais.uol.edu.pk

Abstract

The main theme and purpose of writing this article is to describe the creation of man in the light of Qur'an and science. A review of literature has shown that man always wants to understand and research the mysteries of nature. How and when creation began and its purpose in this world. This curious man sought help from civilizations, nature, old manuscripts, sometimes the prophecies of saints and all religions. Man's quest for his own identity has forced him to find his roots and the best source for this is religious scriptures. The greatest miracle is the Qur'an. The Holy Qur'an contains a beautiful description of the beginning, development and gradual developmental stages of intrauterine life. However, the concept of man evolving in stages was not recognized until much later. But the scientists of the time and most Muslim and non-Muslim scholars do not even know that the Qur'an and pregnancy and delivery or after birth. In fact, the information in the Qur'an and Hadith corrects many superstitious and ambiguous ideas about human development that were prevalent earlier. After reading this article, the reader will easily become acquainted with the reality of creation.

Keywords: Perspective, Creation, Man, Quran, Science

کوئی بھی باشعور شخص اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر گردوپیش پر غور کرے گا تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ کائنات میں ہر جاندار اور بے جان چیز پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے سامنے یہ سوال ضرور آئے گا کہ یہ اشیاء کس نے پیدا کی ہیں ؟۔ "حقیقتِ کائنات" جو کائنات کے ہر پہلو سے عیاں ہے، از خود پیدا نہیں کر ہو سکتی۔ مثلاً نظامِ شمسی اپنے آپ کو پیدا کر کے اس ترتیب میں نہیں لا سکتا، یقیناً پودوں انسانوں نے بھی خود کو نہیں پیدا کیا اور اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سب اتفاقاً وجود میں آگئے تھے۔

چنانچہ ہر چیز جو ہم دیکھتے ہیں پیدا کی گئی ہے، لیکن ہمیں نظر آنے والی کوئی بھی چیز اپنی خالق نہیں ہو سکتی۔ ان کا خالق ان سے علیحدہ اور برتر ہے۔ وہ ہر مرئی چیز سے برتر ہے۔ اگر وہ ارفع اور برتر طاقت نظر نہیں آتی لیکن اس کا وجود مظاہرِ کائنات میں ہر کہیں عیاں ہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جس پر وجود خداوندی کے ماننے والے بھی خود فریبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ در اصل یہ لوگ ایسے ذہنی اور فکری سانچے میں ڈھل چکے ہیں کہ جب تک وہ اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ،اللہ تعالیٰ کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ لوگ تخلیق کے منکر نہیں لیکن وجودِ الٰہی اور اس کے مقام کے حوالے سے توہماتی عقائد کا شکار ہیں۔ ان میں زیادہ تر کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں اوپر آسمانوں میں موجود ہے یا پھر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ خالق کہیں دور ستاروں سے پرے بیٹھا ہے اور امورِ دنیا میں شاذونادر ہی مداخلت کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے کائنات بنائی اور پھر لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ خود اپنے مقدر کا تعین کریں۔

اور پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے سن رکھا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ہر جگہ موجود ہونا مذکور ہے لیکن وہ اس کا درست طور پر ادراک نہیں کر سکتے۔ وہ بس سوچتے چلے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شائد ریڈیو کی لہروں کی طرح یا کسی محسوس گیس کی صورت کائنات کو اپنے احاطے میں لیا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ کو ایک وجود دینے اور پھر اسے کسی جگہ پر موجود ہونے کا طرز فکر ایک ایسی غلطی ہے جو بہت سے لوگ کرتے ہیں اور اسی کے باعث وہ بعض اوقات وجود الہیٰ سے انکار بھی کر بیٹھتے ہیں۔ دراصل انہوں نے بغیر کسی بنیاد کے ایک تعصب پال رکھا ہے۔ یہ تعصب ہی خدا تعالیٰ کے بارے میں غلط آراء کا ذمے دار ہے۔ یہ تعصب ہے کیا؟[1]

دراصل یہ تعصب یا یکطرفہ اور بے بنیاد رائے مادے کی ماہیت کے خصاص کے حوالے سے ہے۔ ہم مادے کی موجودگی کے حوالے سے مفروضات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کبھی یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ آیا یہ واقع موجود ہے یا محض ایک سایہ اور خیال ہے۔ جدید سائنس نے اس کا خاتمہ کر دیا ہے اور ایک نہایت اہم اور خود کو منوا لینے والی حقیقت دریافت کر لی ہے۔

اس حوالے سے تاریخ میں خلافِ مذہب لوگوں اور رجحانات کے طائرانہ جائزے پر فلسفیانہ اصطلاح میں بات کی جائے تو انہیں مادیت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مادیت پرست مسلمہ طور پر تخلیق کی حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں۔ اس کی بجائے وہ کہتے ہیں کہ مادہ ابد سے موجود ہے اور یہ بطور مطلق شے کے تا ابد موجود رہے گا۔ با الفاظ دیگر وہ مادے کو درجہ عبودیت دیتے ہیں۔ ان کے اپنے مآخذ وجودیت کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

"مادیت دنیا کی ہیشگی اور دوام کو تسلیم کرتی ہے، ہیشگی سے مراد یہ ہے کہ اس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ اختتام اور یہ کی اس کا خدا نے پیدا نہیں کیا اور یہ زمان و مکان میں لا محدود ہے۔"[2]

مادیت پسندوں کے مادے پر اس قدر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے وجود کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ اگر مادے کی ابتدا کو مان لیا جائے تو اس کے مضمرات میں سے ایک یہ ہو گا کہ کوئی وقت ایسا تھا جب مادہ وجود میں آیا تھا اور کوئی خالق اسے وجود میں لایا تھا۔

بیسویں صدی کے اختتام پر ساری سائنسی برادری نے تسلیم کرلیا کہ مادہ مطلق نہیں بلکہ اس کا ایک نقطہ آغاز ہے۔ کوئی پندرہ بلین سال پہلے "صفر" حجم کا ایک نقطہ پھٹا اور متواتر پھیلتے پھیلتے اس نے موجودہ کائنات کی شکل اختیار کرلی۔ اس واقع کو بگ بینگ کا نام دیا جاتا ہے۔ نظری طبیعات(Theoretical Pysics)کے تخمینہ جات اور مشاہدات و تجربات سے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

آج سائنس کا جدید ترین نقطہ نظر ہے کہ "کائنات لاشے سے وجود میں آئی" یہی بات قرآن اور تمام مذاہب بیان کرتے ہیں۔ مزید برآں جدید سائنس نے مادیت اور اس کے ذیلی نظریات کو مسترد کردیا ہے۔ اور یوں مادیت پسندوں کی تخلیق کے خلاف جنگ ان کے ہاتھوں سے نکل گئی۔[3]

تاہم مادیت پسندوں کو یہ امر قبول کرنے میں تامل ہے کہ وہ مادہ مطلق نہیں اور کائنات تخلیق کی گئی ہے۔ اپنی اس ہٹ دھرمی میں انہوں نے سائنس میں بھی تضادات پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ۔ اس حقیقت کا تسلیم کرنا وجودِ خداوندی پر ایمان کا متقاضی ہے اور اللہ پر ایمان لانے کی صورت میں مذہب کو تسلیم کرکے اس پر عمل کرنا ضروری ہو جائے گا۔ لیکن مذہب بنیادی طور پر احکامِ خداوندی کے سامنے سرخم تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اپنے غرور سے مغلوب لوگوں کے لئے یہ عمل خاصا تکلیف دہ ہے۔

تخلیقات و موجودات الارض کے حوالے سے فلاسفہ نے اپنی عقل پرستی کے ذریعے تاویلات مبنیہ کے انبار لگا دیے مگر انیسویں صدی عیسوی میں جس نظریہ کو پذیرائی ملی وہ تھا " نظریہ ارتقاء" نظریہ ارتقاء دنیا کا ایک ایسا تصور اور ایک فلسفہ ہے جو زندگی کی ابتدا اور وجود کی وضاحت کے لئے محض اتفاقات کی اصطلاحات میں مفروضے اور تخیلاتی منظر نامے پیش کرتا ہے۔ اس فلسفے اور طرزِ فکر کی بنیادیں قدیم یونانی تہذیب میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

تمام دہریانہ فلسفے جو براہِ راست تخلیق کے منکر ہیں نظریہ ارتقاء سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس کے دفاع کی متواتر کوشش کر رہے ہیں۔ مذہبی لا ادریت کا پرچار کرنے والے تمام دوسرے فلسفے بھی اسی صورتِ حال کا شکار ہیں۔ پچھلی ڈیڑھ صدی کے دوران نظریہ ارتقاء نے اپنے جواز کے لئے سائنس کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اگرچہ نظریہ پچھلی صدی کے وسط میں ایک نام نہاد سائنسی نظریے کے طور پر پیش کیا گیا لیکن تاحال کسی مبسوط نظام دلائل، تجربے یا دریافت سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ در حقیقت وہی سائنس جسے اس نظریے کو پیش کرنے والوں نے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہا تھا اس نظریے کی متواتر تردید کر رہی ہے۔

لیبارٹری کے تجربات اور امکانیاتی حساب کتاب جیسے سائنسی طریقہ کار ثابت کر چکے ہیں کہ ایما ئنو ایسڈ جن پر زندگی کی بنیاد ہے از خود وجود میں نہیں آسکتے۔ خلیے کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ یہ زمین کے پیدا ہونے کے فوراًبعد کے سخت، درشت اور شدید موسمی حالات میں از خود وجود میں آگیا تھا، تا حال بیسویں صدی کے نفیس ترین آلات سے آراستہ لیبارٹری میں بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ارتقاء کے ماننے والوں نے پوری دنیا میں بے شمار کھدائیاں کیں لیکن سر توڑ کوششوں کے باوجود وہ کوئی ایسا رکاز نہیں دریافت کر سکے جسے جانوروں کی کسی دو انواع کے درمیانی اور عبوری کڑی قرار دیا جا سکے۔[4]

ارتقاء کے لیے شہادتیں اکٹھی کرنے کے عمل میں ماہرینِ ارتقاء نہ چاہتے ہوئے اور غیر ارادی طور پر ایسے شواہد اکٹھے کر بیٹھے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ارتقاء جیسا عمل ممکن نہیں۔

ارتقاء کا نظریہ اس شکل میں جو آج ہمارے سامنے ہے اور جس کے دفاع کے لیے سب کوششیں کی جا رہی ہیں ایک غیر پیشہ ور ماہرِ حیاتیات "چارلس رابرٹ ڈارون "(Charles Robert Darwin) نے پیش کیا ڈارون نے سب سے پہلے اپنے نظریات 1859ء میں اپنی کتاب" The

"Origin of Species By Means of Natural Selection" میں پیش کیے۔ڈارون نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا کہ:

"All the animal items were combined and the source was the same. The animals that have adapted to their environment and have shifted their properties to the next generation are different from their ancestors and at one point they became a separate species. He believe that the most advanced generation in this natural selection process is the human race".[5]

" تمام جاندار اشیاء کا مبداء اور منبع مشترکہ اور ایک ہی تھا۔ وقفے سے جانور جنم لیتے گے وہ جانور جنہوں نے اپنے آپ کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھال لیا اور اپنے یہ خصائص اگلی نسل میں منتقل کر دیئے وہ اپنے آباؤاجداد سے مختلف ہوتے گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بجائے ایک علیحدہ نوع کی شکل اختیار کر گئے۔ اس کا خیال ہے کہ فطری انتخاب کے اس طریقہ کار میں جو نسل سب سے زیادہ ترقی یافتہ وجود میں آئی وہ انسانی نسل ہے"۔

اس وقت کے نظریاتی اور سیاسی حلقوں نے ڈارون (Darwin) کے تخیلات پر مبنی نظریات کو فوراً اپنا لیا اور ان کی ترویج شروع کر دی۔ یہ نظریہ اس طرح مقبول ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک سائنسی علم اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ ڈارون کے پیش کردہ غیر سیاسی نظریات کو جھوٹ ثابت کیا جا سکے۔ اس وقت تک جینیات خورد حیاتیات (Microbiology) اور حیاتی کیمیا (Biochemistry) جیسے مضامین وجود میں نہیں آئے تھے ۔ اگر نظریات وجود میں آچکے ہوتے تو خود ڈارون کو علم ہو جاتا کہ اس کا نظریہ بے معنی ہے۔ نوع کی

ہیئت طے کرنے والی معلومات جین میں موجود ہوتی ہیں اور فطری انتخاب کے ذریعے جین میں تبدیلیاں لاکر اس طرح کی نئی انواع پیدا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

ابھی فضا میں ڈارون کی کتاب کی بازگشت باقی تھی کہ 1865ء میں آسٹریا کے ایک ماہرِ نباتیات جارج مینڈل(George Mendel)نے قوانین وراثت پیش کیے۔ صدی کے آخر تک اس کے کام پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اس کے کام کی اہمیت کو 1900ء کے شروع میں از سر نو محسوس کیا گیا اور اسی وقت جینیات "Genetics" کے متعلق نظریات پیش کئے جانے لگے۔1950ء میں ڈی ۔این۔اے "DNA" مالیکیول کے متعلق یہ دریافت ہوا کہ یہ توارثی معلومات کی منتقلی کا ذریعہ ہے۔ اس دریافت نے نظریہ ارتقاء کو بحران میں مبتلا کر دیا کیونکہ محض اتفاقات سے "DNA" میں موجود بے پناہ معلومات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔

ان نئی سائنسی دریافتوں کے ساتھ ساتھ نظریہ ارتقاء پر کئے جانے والے کام نے بھی ثابت کر دیا کہ زندہ اجسام کی انواع کے بمراحل ارتقاء کے شواہد تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سالوں کی تلاش کے باوجود ایسے جانوروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا جن کے متعلق حتمی طور پر کہا جاسکے کہ یہ کم ترقی یافتہ اور ترقی یافتہ جانوروں کی درمیانی کڑی ہیں۔

اس صورت حال میں چاہئے تو یہ تھا کہ نظریہ ارتقاء کو کوڑادان میں پھینک دیا جاتا لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ کچھ ایسے حلقے بھی تھے جو اسی نظریے میں متواتر تبدیلی اور ترمیم کے ذریعے اسے سائنسی منظر نامے پر بطور ایک نظریے کے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کوششوں کی معنویت اسی صورت میں ثابت ہو سکتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نظرئے کے ساتھ کچھ حلقوں کے غیر سائنسی مفادات بھی وابستہ تھے۔

اس نظریے کو جاری رکھنے پر مصری حلقوں نے کچھ ضروری تبدیلیاں کرنے کے بعد اسی نظریے کو نو ڈارونیت کے نام سے قائم رکھا۔ اس نئے نظریے کے مطابق جانوروں کی نئی انواع جین میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں Mutation کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ ان میں سے بہت سی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئیں صرف وہی بچ پائیں جو اپنے ماحول کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی تھیں۔ لیکن جب یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ نئے نظریہ کی تجویز کردہ میوٹیشن بھی نئی انواع وجود میں نہیں لا سکتی تو ارتقاء دان اسی نظریے کے نئے ماڈل تلاش کرنے لگے۔ اب انہوں نے "Galloping Evolution" نامی ماڈل پیش کیا اس ماڈل کی کوئی سائنسی یا عقلی بنیادیں موجود نہ تھیں۔ اس ماڈل کے مطابق یہ دعویٰ کیا گیا کہ زندہ اشیاء، اچانک دوسری انواع میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور اس دوران کوئی عبوری نوع وجود میں نہیں آتی۔ در حقیقت اس طرح کا دعویٰ نظریہ تخلیق کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا لیکن ارتقاء دان اس امر کو تسلیم کرنے سے بھاگتے تھے۔ یوں انہوں نے اپنی کم فہمی کو چھپانے کی غیر منطقی کوششیں جاری رکھیں۔ مثال کے طور پہ کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ تاریخِ حیات کا پہلا پرندہ بغیر کسی وجہ کے اور اچانک کسی رینگنے والے جانوروں کے انڈوں سے برآمد ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تبدیلی کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اسی طرح ان کا دعویٰ ہے کہ خشکی کے گوشت خور جانور بغیر عبوری تبدیلیوں سے گزرے اچانک دیو قامت وہیل مچھلی میں تبدیل ہو گئے۔[6]

ارتقاء پسندوں کے یہ تمام دعوے جینیات، حیاتی کیمیا اور حیاتی طبیعات کے اصولوں سے متصادم ہیں اور یہ اتنے ہی غیر سائنسی ہیں جتنا خیالی کہانیوں میں، مینڈکوں کا شہزادوں میں تبدیل ہونا۔ اس ماڈل کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ رکازی آثار میں پائے جانے والے اس خلا کی تشریح کی جا سکے جو نو ڈارونی ماڈل کے مطابق نہیں کی جا سکتی لیکن پرندوں کے ارتقاء کے متعلق رکازی آثار میں جو خلا پایا

جاتا ہے اس کی وضاحت کے لیے ایسا دعویٰ کرنا خلاف عقل ہو گا کہ ایک رینگنے والے جانور کے انڈے سے پہلا پرندا نمودار ہوا تھا۔ ایسا امر بجائے خود ارتقادانوں کے دعووں کی تردید ہو گا کہ انواع کا ارتقاء اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ جینیاتی نظام میں محفوظ اطلاعات میں کوئی بڑی اور افادی تبدیلی ہو لیکن میوٹیشن جیسی تبدیلی نہ تو جینیاتی اطلاعات میں بہتری لا سکتی اور نہ ہی اس میں اضافہ کر سکتی ہے۔ میوٹیشن فقط جینیاتی اطلاعات میں انتشار پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ اگر ارتقاء کے نئے توازنی ماڈل کی پیش کردہ کلی میوٹیشن کو مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب کلی تقلید کی بجائے کلی تخریب ہو گا کیونکہ ایسی کوئی جینیاتی تبدیلی جینیاتی اطلاعات میں تکسیر اور اور تخریب کا سبب بنے گی۔ ارتقاء کا یہ نیا خاکہ محض تخیل کی پیداوار تھا۔ اس واضح خامی کے باوجود ارتقاء دان اس نئے خاکے کو اہمیت دیتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ رکازی آثار ڈارون کے نظریے کی تائید نہیں کرتے ۔ڈارون کا نظریہ تھا کہ انواع میں بمراحل اور بتدریج تبدیلیاں آئیں۔ اگر ڈارون کا یہ دعویٰ درست ہوتا تو لازماً ایسے رکاز دریافت ہو جاتے جو نصف پرندے اور نصف رینگنے والے جانور کے متعلق ہوتے لیکن باوجود وسیع کھدائیوں کے اور لاکھوں رکاز دریافت کر لینے کے ایسی عبوری اشکال دریافت نہ ہو سکیں۔

ارتقاء دانوں نے رکازی آثار کی صورت میں سامنے آنے والی اپنی اس ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے نظریہ ارتقاء کا یہ نیا ماڈل پیش کیا۔ چنانچہ یہ ماڈل خود مکتفی ثابت نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے حقائق سے فرار کی یہ شکل بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ آج کے ارتقاء دان دریافت کر چکے ہیں کہ آنکھوں، پروں، پھیپھڑوں اور دماغ جیسے پیچیدہ اعضاء بتدریج ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ ان

خاص مشکل مقامات پر اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کے لئے نظریہ ارتقاء کے اپنے ماڈل میں ایسی تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں جو منطق اور عقل دونوں کے خلاف ہیں۔

انواع کا نظریہ ارتقاء:

نظریہ ارتقاء کی رو سے ایک نوع کا دوسری میں بدلنے کے لئے لاکھوں سال پر محیط تدریجی عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔اس دعوے سے منطقی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس تقلیبی دور میں بننے والی عبوری مخلوق کے آثار موجود ہونے چاہئیں اور چونکہ ہر نوع بتدریج اور ایک لمبے عرصے کے ارتقاء سے وجود میں آئی اس لئے ان عبوری اشکال کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہونی چاہئے۔اگر ایسی مخلوق حقیقتاً موجود رہی ہوتی تو ہمیں کہیں نہ کہیں ان کی باقیات ملنی چاہئیں تھیں۔اور اگر یہ انداز فکر واقعی درست ہوتا تو ان عبوری مخلوقات کی تعداد کے آثار اور باقیات کو آج زندہ انواع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہونا چاہئے تھا اور دنیا کے ہر حصے میں ان کی باقیات کھدائی سے برآمد ہونی چاہئے تھیں۔

ڈارون کے وقت سے لے کر ماہرینِ ارتقاء رکاز کی تلاش میں ہیں لیکن تاحال مایوسی کے انہیں کچھ میسر نہیں ہوا،نہ خشکی پر اور نہ سمندر میں انہیں کوئی ایسے رکاز ملے ہیں جنہیں کسی دو انواع کے ارتقائی مراحل کی درمیانی عبوری شکل قرار دیا جاسکے۔

ڈارون خود بھی آگاہ تھا کہ ایسی عبوری شکل موجود نہیں ہے لیکن اسے بہت زیادہ امید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ماہرین ایسے ڈھانچے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے،اس امید کے باوجود اسے علم تھا کہ اس کے نظریے کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے اس حوالہ سے وہ اپنی کتاب "The Origin of the Species" میں لکھتا ہے۔

"If it is true that the inuates gradually evolved after generations, then why don't we get the interim signs? This theory should have many transient creatures and we should find their structures in the earth, but we don't see these transient forms in the rest of the world, and this difficulty has kept me in the state for a long time".[7]

"اگر یہ سچ ہے کہ انواع بتدریج نسل بعد نسل ارتقاء پذیر ہوئیں تو پھر ہمیں عبوری اشکال کیوں نہیں ملتیں ؟ایسا کیوں ہے کہ انواع بجائے مبہم شکل ملنے کے واضح طور پر متعین اشکال میں نظر آتی ہیں۔اس نظریے کی رو سے بے شمار عبوری مخلوق موجود ہونی چاہئے اور ہمیں ان کے ڈھانچے جابجا قشرِ ارض میں ملنے چاہئیں لیکن ہمیں یہ عبوری اقسام رکازی آثار میں نظر نہیں آتیں اس مشکل نے ایک لمبے عرصے سے مجھے تذبذب میں ڈال رکھا ہے"۔

ڈارون کی یہ پریشانی بلا وجہ نہ تھی ، آج بھی ارتقاء دان اس مسئلے پر پریشان ہیں ۔مشہور برطانوی رکازدان "ڈیرک وی ایگر"Derck V Ager اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتا ہے۔

"When we study the re-entry in detail, we do not receive evidence of gradual evolution, but it seems that the second group suddenly appeared after the group was exposed".[8]

"جب ہم رکازی ریکارڈ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بتدریج ارتقاء کے شواہد میسر نہیں آتے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گروہ کے ناپید ہونے کے بعد دوسرا گروہ اچانک منظرِ عام پر آیا"۔

رکازی ریکارڈ میں پائے جانے والے اس خلا کے حوالے سے یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہوا جاسکتا کہ ابھی تک مناسب تعداد میں رکاز دریافت نہیں ہوئے اور کسی نہ کسی دن ایسے رکاز مل جائیں گے۔ایک اور رکازدان "ٹی نوائل جارج"T.Nawil George دلیل دیتا ہے کہ:

رکاز آثار کے ناکافی ہونے پر کسی معذرت خواہانہ رویے کی ضرورت نہیں۔ اب تک ملنے والے ریکارڑ میں یہ خلا باقاعدہ طور پر موجود ہے"۔

اس حوالے سے مثال پیش ہے کہ ارتقاء کے نہایت اہم ثبوت جو مسترد کر دیئے گئے۔ مچھلی کے 420 ملین برس پرانے فوصل ارتقاء پسندوں کا یہ دعویٰ مسترد کرتے ہیں کی انسان ارتقائی مراحل کا نتیجہ ہے ،اس حوالے سے کہ مچھلی کس طرح پانی سے خشکی پر منتقل ہوئی، یہ حقیقت کے اس مچھلی کی 40 سے زیادہ زندہ مثالیں موجود ہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران اسے کئی بار پکڑا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسی مکمل مچھلی ہے جو آج بھی زندہ ہے۔"بائیں " 135 ملین برس پرانا فوصل جو "Archaeop Teryx" کا تھا جسے پرندوں کا جدِ امجد بتایا گیا۔ اور جس کے متعلق یہ کہا گیا کہ یہ ڈائنو ساروں سے بذریعہ عمل تغیر وجود میں آیا تھا۔ اس فوصل پر کی گئی تحقیق سے پتا چلا کہ یہ ایک ناپید پرندہ ہے جو کبھی اڑتا تھا۔[9]

زندگی کا مبداء اور اس کی حقیقت:

جب ہم زمین کے طبقات میں پائے جانے والے رکاز کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ زندہ اجسام اچانک اور بیک وقت نمودار ہوئے۔ زمین کی پرانی تہہ جس میں زندہ مخلوق کے رکاز ملتے ہیں کیمیرین عہد کی ہے۔ یہ تہہ کوئی پانچ سو تیس سال سے لے کر پانچ سو بیس ملین سال پرانی ہے۔

کیمیرین عہد میں پائی جانے والی مخلوق اچانک نمودار ہوئی اور اس سے پچھلی تہہ میں ایسے کوئی آثار نہیں ملتے جنہیں کیمیرین عہد کے جانداروں کا آباؤاجداد کہا جاسکے۔ اس میں ملنے والے جانداروں کی انواع اتنی زیادہ ہیں اور یہ متنوع مخلوق پیچیدہ ہے کہ ان کے ظہور میں آنے کو کیمیرین فشار کا نام دیا جاتا ہے۔

زمین کے اس طبق سے ملنے والے جاندار آنکھ، پر اور دورانِ خون جیسے پیچیدہ اور ترقی یافتہ نظاموں سے آراستہ ہیں۔ رکازی آثار میں ایسے کوئی شواہد نہیں ملتے کہ ان مخلوقات کے کوئی آباؤاجداد بھی موجود رہے ہوں گے۔ مشہور رسالے "Earth Science" کا ایڈیٹر "Richard Monestarsky" زندہ اشیاء کے اس طرح اچانک نمودار ہونے پر لکھتا ہے:

"Half a billion years ago, we had a lot of complex animals that we see today. Some 550 million years ago, when the earth entered the Cameron era, there was an evolutionary explosion and all the oceans were filled with the first complex beings. Most of today's animals have evidence of their presence in the Cameraan era and they were as familiar and familiar as they are today".[10]

"نصف بلین سال پہلے ہمیں آج نظر آنے والے کافی پیچیدہ جانور نمودار ہو چکے تھے۔ کوئی پانچ سو پانچ ملین سال پہلے جب زمین کیمرین عہد میں داخل ہوئی تو ایک ارتقائی دھماکہ ہوا اور تمام سمندر پہلی پیچیدہ مخلوق سے بھر گئے۔ آج کے جانوروں کی بیشتر انواع کے کیمرین عہد میں بھی موجود ہونے کے شواہد ملتے ہیں اور یہ اس وقت بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی متمیز اور متشخص تھے جتنے یہ آج نظر آتے ہیں"۔

ارتقاء پسندوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ زمین اچانک مختلف انواع کے جانوروں سے کس طرح بھر گئی۔ وہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کیمرین عہد سے بیس بلین سال پہلے ایک فرضی عہد کا موجود ہونا فرض کر لیتے ہیں جس میں زندگی کا یکایک بمع اپنے تنوع کے وجود میں آنے کا

واقعہ رونما ہوا۔ اس عہد یہ ماہرین ارتقائی خلیج کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ایسے کسی عہد کے موجود ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی اور ان کا یہ فرضی عہد آج تک قیاس آرائی کی دھند میں لپٹا ہوا ہے۔

1984ء میں چین کے جنوب مغربی صوبے "چنگ جیان" میں پیچیدہ غیر فطری جانوروں کے کچھ رکاز بر آمد ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ جانور آج ناپید ہو چکے ہیں۔ لیکن دریافت ہونے والے جانور بھی آج کے جانوروں کے مقابلے میں کچھ کم پیچیدہ نہیں۔

سویڈن کا ماہرِ ارتقاء "سٹیفن بینگسٹن"(Stephan Bengston) اس صورتِحال کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"If there is a human being created in history, then that is the process of suddenly diversifying the marine life, which has dominated the environment and evolution of marine life. This also made Darwin nervous and it was causing us a problem".[11]

"اگر تاریخ حیات میں تخلیق انسان جتنا پر اسرار واقعہ کوئی موجود ہے ب تو وہ یہی بحری حیات اچانک متنوع ہو جانے کا عمل ہے، جس میں سمندری حیات کی ماحولیات اور ارتقاء میں کثیر خلوی جانوروں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس امر نے ڈارون کو بھی گھبراہٹ میں دال دیا تھا اور یہ امر ہمارے لئے بھی پیچیدگی پیدا کر رہا تھا"۔

پیچیدہ زندہ اجسام کا بغیر کسی آباؤاجداد کے اچانک ظہور میں آجانا جس قدر ڈارون کے لئے ایک سو پینتیس سال پہلے حیران کن تھا اسی طرح آج کے ماہرین کے لئے بھی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی بعد بھی ڈارون کا پیش کردہ یہ نظریہ اپنے ابتدائی مفروضوں سے ایک قدم آگے نہیں چل سکا۔

بہر حال رکاز کا آثار سے ثابت ہو چکا ہے کہ زندہ اشیاء میں اس طرح کا کوئی ارتقاء نہیں ہوا کہ انہوں نے سادہ سے پیچیدہ کی طرف سفر کیا ہو بلکہ وہ ایسی اور مکمل شکل میں پیدا ہوئی تھیں۔ عبوری شکل اور ماہیت کا عدم وجود صرف کیمرین عہد کی خصوصیت نہیں بلکہ کسی بھی ارتقائی ترقی کا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جو یہ بتا سکے کہ جب یہ خاص نوع میں بدلی تا درمیان میں یہ خاص عبوری شکل اختیار کر گئی۔ باالفاظ دیگر تما جاندار پیدا کئے گے نہ کہ یہ بذریعہ ارتقاء وجود میں آئے۔

نظریہ ارتقاء کے ثبوت:

نظریہ ارتقاء کے ثبوت دریافت کرنے کی کوشش کرنے والے زیادہ تر رکازی آثار پر انحصار کرتے ہوئے اگر بغیر تعصب کے بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ رکازی آثار نظریہ ارتقاء کی تائید نہیں کرتے بلکہ اسے مسترد کرتے ہیں۔ لیکن ارتقاء دان رکاز کی من چاہی اور موضوعی تشریح کرتے ہوئے عام لوگوں کے سامنے یہ تاثر دیتے ہیں کہ گویا رکازی آثار نظریہ ارتقاء کے شواہد ہیں۔ جو کچھ رکاز کے سلسلے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کو تمام رکاز آثار پر اس طرح منطبق کرتے ہیں کہ ان کا دعویٰ درست ثابت ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین کھود کر جو رکاز نکالے جاتے ہیں ان کی تسلی بخش شناخت نہیں ہو پاتی۔ عام طور پر یہ رکاز بکھری ہوئی ہڈیوں کے نامکمل ٹکڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے دستیاب اعداد و شمار کی من چاہی تعبیر ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حیرت کی بات نہیں کہ ان رکاز کو سامنے رکھ کر ماہرینِ ارتقاء قیاس پر مبنی جو خاکے بناتے ہیں ارتقاء کی حمایت میں ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کو پہلے سے ہی متاثر کیا جا چکا ہوتا ہے، وہ ان خیالی خاکوں کو دیکھ کر یقین کرنے لگتے ہیں کہ ایسے جاندار ماضی میں واقعی رہے ہوں گے۔

ہڈیوں کے باقیات پر کے مطالعے پر مبنی یہ خاکے ان جانداروں کی صرف عمومی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں، حقیقی فرق صرف نرم بافتوں میں موجود ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ غائب ہو چکی ہوتی ہیں۔ نرم بافتوں کے غائب ہو جانے کے بعد موجود ہڈیوں پر کوئی بھی شخص اپنے تخیل کے مطابق قیاس آرائی پر مبنی شکل تیار کر سکتا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر (Earnest A.Hutton) اس صورتِ حال کی یوں وضاحت کرتا ہے:

"The construction of soft parts is more difficult. Bones cannot be found about the lips, eyes, ears and nose. You can build a monkey and a philosopher's face with a uniform on a tender skull. The scientific scope of the theories of such ancient and early human existence is very small. Such theories are usually the cause of the error of the al-Naas. So building complete animals based on the remnants of the stoic is not a danger".[12]

"نرم حصوں کی تعمیر زیادہ مشکل کام ہے۔ ہونٹ، آنکھیں، کان اور ناک کے متعلق ہڈیوں سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ آپ ایک نینڈر تھل کھوپڑی پر یکساں سہولے کے ساتھ ایک بندر اور ایک فلاسفر کا چہرہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ انسانوں کی اس طرح کی قدیم اور ابتدائی اقسام کے موجود ہونے کے نظریات کی سائنسی وقعت اگر کوئی ہے تو بہت کم ہے۔ ایسے نظریات عامتہ الناس کی گمراہی کا سبب ہیں۔ اس لئے باقیات ست قیاس آرائی پر مبنی مکمل حیوانات تعمیر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے"۔

پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown Man)

1912ء میں ایک انگریز معالج اور شوقیہ رکاز دان "چارلس ڈاسن" نے اعلان کیا کہ اسے پلٹ ڈاؤن (Piltdown) کے قریب ایک گڑھے سے ایک قدیم کھوپڑی اور جبڑا ملا ہے۔ اگرچہ کھوپڑی انسان کی سی تھی لیکن جبڑے کی ساخت کے بندر کے زیادہ قریب تھی۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ دونوں پانچ لاکھ سال قدیم ہیں۔ جس شخص کی یہ کھوپڑی تھی اسے پلٹ ڈاؤن مین "Piltdown Man" کا نام دیا گیا ہے۔ چالیس سے زیادہ سال تک اس انسان پر تحقیقات جاری رہیں جس کی یہ کھوپڑی تھی۔ اس پر کئی مقالے تحریر کیے گئے۔ اس کھوپڑی کی بنیاد پر پلٹ ڈاؤن مین اور اس کے اہلِ خانہ کی تصاویر بنائی گئیں۔ اس کھوپڑی کو نظریہ ارتقاء کے فیصلہ کن ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔

1949ء میں سائنس دانوں نے اس کھوپڑی کا دوبارہ جائزہ لیا اور نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی دریافت کا دعویٰ کرنے والے نے جان بوجھ کر فریب کاری سے کام لیتے ہوئے انسانی کھوپڑی کے ساتھ "Orangutan" کا جبڑا ملا دیا ہے۔

فلورین تابکاری کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے محققین نے دریافت کیا کہ کھوپڑی چند ہزار سال سے پرانی نہیں۔ بندر کی ایک نسل سے تعلق رکھنے والے جبڑے کے دانتوں کو مصنوعی طریقے سے گھسایا گیا اور اس کے قریب پائے گے پتھر کے اوزار بھی در اصل لوہے کے اوزاروں سے تراشے گئے تھے۔ بعد میں ایک بار پھر 1953ء میں تجربہ کیا گیا اور یہ فریب کاری عوام کے سامنے آئی کہ دراصل کھوپڑی پانچ سو سال پرانے انسان کی تھی اور یہ جبڑا بعد میں اس کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ پھر ان سب ٹکڑوں کو پوٹاشیم ڈائی کرومیٹ میں ڈبویا گیا تھا تاکہ پرانی ہڈی کا خاص رنگ واضح ہو جائے۔ جب اس ہڈی کو پانی میں ڈبویا گیا تو اس کے اصل دھبے غائب ہو گئے۔ تحقیقاتی ٹیم کا ایک رکن لے کر اس طرح اپنی حیرت نہ چھپا سکا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

"مصنوعی گھسائی فوراً نظر آگئی۔ یہ اتنی واضح ہے کہ ایک طویل عرصے تک اس کا آنکھوں سے اوجھل رہنا خود حیران کن تھا"[13]

نبراسکامین(Nebraska Man)

1922ء میں "ہینری فیر فیلڈ"(Henry Fair Field) نے اعلان کیا کہ اسے مغربی نبراسکا میں "سنیک برگ" کے قریب ایک داڑھ ملی ہے "ہینری فیر فیلڈ" امریکہ کے نیچرل ہسٹری میوزیم کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس دانت میں انسانی اور بندر کے دانت دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس پر ایک طویل بحث کا آغاز ہو گیا۔ کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ اس کا تعلق ابتدا میں پائے جانے والے ایک انسان "Patheon Thropus Frectus" سے ہے۔ جبکہ کچھ اسے اسے جدید انسان سے زیادہ قریب مانتے تھے۔ تاہم اسی جھگڑے میں اس متنازع انسان کو "نبراسکا مین" کا نام دیا گیا ۔ جلد ہی اس کو اس کا سائنسی نام "Hesperopithecus Haroldcooki" بھی دیا گیا۔[14]

بہت سے ماہرین نے فیر فیلڈ کے نظریے کی حمایت کی۔ اس اکیلے دانت کی بنیاد پر نبراسکا مین کا پورا چہرہ اور جسم بنادیا گیا اور تو اور اس کے پورے خاندان کی خیالی تصاویر بنائی گئیں۔

1927ء میں اس ڈھانچے کا باقی حصہ بھی دریافت کر لیا گیا۔ نئے دریافت شدہ ٹکڑوں کے مطابق کی گئی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ دانت نہ انسان کا تھا اور نہ ہی بندر کا۔ ماہرین آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ دانت امریکہ میں بسنے والے ایک ایسے سور کی نسل سے تعلق رکھتے ہے جو ایک عرصہ ہوا معدوم ہو چکی تھی۔

انسان اور بندر میں ارتقائی مراحل کی تحقیق:

ارتقائی مراحل کے حوالے سے "چارلس ڈارون" کہتا ہے "

"According to the evolutionary theory, modern humans and monkeys are the children of the same ancestors. Over time, one part of the descendants of this ancestors evolved and became human beings of today".[15]

نظریہ ارتقاء کے دعوے کے مطابق جدید انسان اور بندر ایک ہی آباؤاجداد کی اولاد ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ اس آباؤاجداد کی اولاد کا ایک حصہ ارتقاء پزیر ہو کر آج کا انسان بن گیا اور دوسرا حصہ آج کا بن مانس۔

نظریہ ارتقاءکے ماہرین نے انسان اور بن مانس کےاس فرضی آباؤاجداد کو "Australopithecus" کا نام دیا ہے۔جس کا مطلب ہے ساؤتھ افریقہ کا بن مانس۔یہاں تک اس مبینہ بندر کا تعلق ہے تو یہ بن مانس کی ایک ایسی نسل ہے جو اب معدوم ہو چکی ہے۔اس سے ملتی جلتی انواع اب بھی پائی جاتی ہیں۔ان میں سے کچھ مضبوط اور جسیم جبکہ کچھ چھوٹے اور منحنی ہیں۔

ارتقاء دانوں نے انسانی ارتقاء کے اگلے مرحلے کو "Homo" کا نام دیا ہے۔جس کا مطلب ہے انسان ۔ارتقاءدانوں کے مطابق "ہومو" سلسلے کے جاندار "Australopithecus" کے مقابلے میں نسبتاً ترقی یافتہ ہیں لیکن یہ موجودہ جدید انسان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ان ماہرین کا خیال ہے کہ آج کا انسان یعنی "Homo Sapten" ارتقاء کے سب سے آخری مرحلے میں وجود میں آیا۔

معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ ماہرین ارتقاء کے وضع کردہ اس فرضی منظر نامے میں "Australopithecus" شخص ایک بن مانس ہے جو معدوم ہو چکا ہے۔جبکہ جن انسانوں کو وہ "Homo" سلسلے کی مختلف کڑیاں قرار دیتے ہیں دراصل وہ ماضی میں بسنے والے انسان تھے جو معدوم ہو گئے۔

ارتقاء دانوں نے بندروں اور انسانوں کے مختلف ملنے والے رکاز کو جسامت کے اعتبار سے بڑی سے چھوٹی ترتیب دیا اور اسے انسانی ارتقاء کے اپنے منصوبے میں من چاہے طریقے سے استعمال کیا۔ تاہم سائنسی حقائق بیان کر چکے ہیں کہ ان رکاز سے کسی طرح بھی ارتقاء کی شہادت نہیں ملتی۔ ان رکاز میں سے کچھ حقیقی بندروں کے ہیں اور کچھ حقیقی انسانوں کے۔ کوئی فرق اگر موجود ہے تو وہ صرف جسامت کا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی حقیقی فرق موجود ہونے کے شواہد نہیں ملتے۔[16]

آسٹریلوپیتھی کس: معدوم بندر (Australopithecus Extinct Apes)

ارتقاء دانوں کا دعویٰ ہے کہ آسٹریلوپیتھی کس جدید انسان کے قدیم آباؤاجداد ہیں۔ اس قدیم مخلوق کی کھوپڑی اگرچہ جدید بن مانس سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اس کے مغز کا خانہ نسبتاً چھوٹا ہے۔ ارتقاء دان کہتے ہیں کہ یہ جاندار دو پاؤں پر چلتا ہے اس لئے اسے جدید انسان کا آباؤاجداد تصور کیا جا سکتا ہے۔

انسان اور بندر کی حرکات قطعی مختلف ہیں۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جو دو پاؤں پر آزادی سے چل سکتی ہے۔ اس طرح کی محدود سی صلاحیت کچھ اور جانداروں میں بھی ملتی ہے لیکن بنیادی طور پر ان کا ڈھانچا خمیدہ چال کے لئے ہے۔

ماہرین ارتقاء کے مطابق آسٹریلوپیتھی کس کی چال آج کے انسان کی طرح سیدھی تھی۔ انہوں نے اس کی نسبت سیدھی دو پاؤں پر چال کو بنیاد بناتے ہوئے اسے موجودہ انسان کا آباؤاجداد قرار دے دیا۔

آسٹریلوپیتھی کس کے دو پاؤں پر چلنے کی صلاحیت سے انکار بھی سب سے پہلے ارتقاء پسندوں کی طرف سے سامنے آیا۔ ان ڈھانچوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد قرار دیا گیا کی آسٹریلوپیتھی کس انسان کی نسبت بندر کے زیادہ قریب تھا۔

1970ء میں "چارلس ای آکسنرڈ"(Charles E.Oxanerd) نے تفصیلی مطالعہ کے بعد اعلان کیا کہ اس کا ڈھانچہ آج کے اور "اورنگوٹان"(Orang-Utan) سے مشابہ ہے۔

جس دریافت نے ارتقاء دانوں کو واقعی مایوس کیا وہ یہ تھی کہ آسٹریلو پیتھی کس جھکے ہوئے انداز میں بھی دو پاؤں پر نہیں چل سکتا تھا۔ نئی حیاتی طبیعات سے ثابت ہوا کہ آسٹریلو پیتھی کس کو اس طرح چلنے کے لئے بے پناہ توانائی خرچ کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے اس کا دو پاؤں پر جھک کر چلنا خارج از امکان ہے۔ 1996ء میں ایک انگریز ماہرِ حیاتیات "رابن کرمپٹن" نے کمپیوٹر پر بنائے جانے والے خاکوں سے ثابت کیا کہ "اس طرح کی مرکب چال ممکن نہیں"۔[17]

حیوانات یا تو بالکل سیدھا چلتے ہیں یا پھر چاروں ہاتھوں پاؤں پر۔ چلنے کے ان دو طریقوں کے بین بین کوئی طریقہ لمبے عرصے کے لئے اختیار کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح توانائی کا بے پناہ ضیاع ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ آسٹریلو پیتھی کس نہ تو جھک کر چلتا تھا اور نہ دو پاؤں پر۔

آسٹریلو پیتھی کس دو پاؤں پر نہ چلنے کی سب سے مضبوط شہادت 1994ء میں ایک ماہر علم الابدان "فریڈ سپور"(Frde Spoor) نے پیش کی جو انگلینڈ میں " University of Liverpool" کے " Department of Human Anatomy and Cellular Biology" کا چیئر مین ہے۔[18]

اس گروپ نے رکازی حالت اختیار کر جانے والے جانداروں کے دو پایہ ہونے پر تحقیقات کیں۔ ان کی تحقیق کان کے اندر پائے جانے والے ایک آلے کے گرد گھومتی تھی جو دو پایہ چال کو متوازن رکھنے کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کن طور پر ثابت کر دیا کہ آسٹریلو پیتھی کس دو پایہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے نتیجے سے اس حیوان کے انسان کی طرح کے ہونے کی تردید ہو گئی۔

ہوموسیریز: اصل انسان (Homo Series)

خیالی انسانی ارتقاء کی اگلی منزل ہومو (Homo) یعنی کہ انسانی سلسلے ہیں۔ یہ مخلوق دراصل انسان ہی کی اور کسی بھی طرح آج کے جدید انسان سے مختلف نہیں تھی۔ بس اتنا فرق تھا کہ یہ انسان مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ارتقاء دانوں نے ان کی جسمانی ساخت میں پائے جانے والے بہت تھوڑے فرق کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور انہیں مختلف نسلوں کی بجائے علیحدہ علیحدہ انواع قرار دیا۔ تاہم جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس ہوموسیریز سے تعلق رکھنے والے انسان ہمارے ہی جیسے تھے۔

ارتقاء دانوں کے تخیل پر مبنی منظر نامے کے مطابق انسانی انواع مین ہونے والے ارتقاء کے مطابق ہومو کو ان ذیلی انواع میں بانٹا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے "Homo Erectus" اس کے بعد دوسرے نمبر پر "Homo Sapien Archaic" اور "Nanderthal Man" ان کے بعد "Cro Mangnan Man" اور سب سے آخر میں جدید انسان کی باری آتی ہے۔

ارتقاء دان کے دعووں کے برعکس ان کی گنوائی ہوئی تمام انواع دراصل اصل انسان ہی ہیں۔ آیئے سب سے پہلے "ہومو اریکٹس" کا جائزہ لیتے ہیں جسے ارتقاء دان انسانی انواع میں سے قدیم ترین گردانتے ہیں۔

"ہومو اریکٹس" Homo Erectus کے قدیم کے نوع نہ ہونے کا سب سے واضح ثبوت "ترکانہ بوائے" (Turkana Boy) ہے۔ ماہرین کے نزدیک "ہومو اریکٹس" Homo Erectus کی باقیات میں سے یہ قدیم ترین ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کے بارہ سالہ یہ لڑکا 73۔1 میٹر لمبا ہوگا۔ اس رکاز کا کھڑا ڈھانچہ آج کے انسان سے کسی طور مختلف نہیں۔ یہ رکاز اس امر کی اہم ترین شہادت ہومو

اریکٹس بھی دراصل آج کی انسانی نسل ہی تھی۔ ارتقاء دان "رچرڈلی کے "(Rechard Leakey) ہوموار یکٹس اور جدید انسان کا تقابل کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"The observer will see the skull's eyesight, the angle of the face and the bone of the eyebrows. None of these things are dramatically different from the modern man. If there is a difference, it is only as much as it is found among different generations of human beings today. When a population is geographically isolated for a long time, such differences become normal".[19]

"مشاہدہ کرنے والا کھوپڑی کی شباہت، چہرے کا ابھار کا زاویہ اور بھوؤں کی ہڈی کا ابھا دیکھے گا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ڈرامائی طور پر جدید انسان سے الگ نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے بھی تو فقط اتنا ہے کہ جتنا آج کے انسان کی مختلف نسلوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ جب کسی آبادی کو لمبے عرصے تک جغرافیائی طور پر الگ رکھا جائے تو اس قسم کے فرق معمولات ہو جاتے ہیں"۔

لیکے (Leakey) کا مطلب یہ ہے کہ "ہوموار یکٹس" Homo Erectus آج کے انسان سے محض اتنا مختلف ہے جیتنا آج کا "نیگرو" آج کے "ڈسکیمو" سے۔ کھوپڑی کا یہ فرق دودھ پلانے کے طریقے اور دوسری انسانی نسلوں سے لمبے عرصے تک اکٹھے رہنے کے نتیجے میں بھی نمودار ہو سکتا ہے۔

"ہوموار یکٹس" Homo Erectus کی ایک علیحدہ نوع نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس دریافت ہونے والے رکاز میں سے ستائیس ہزار اور کچھ تیرہ ہزار سال پرانے ہیں۔ اول الذکر جزیرہ "جاوا" (Java) میں دریافت ہوئے جبکہ مؤخر الذکر آسٹریلیا کے علاقے کے "کو" (Kow) میں ملے۔ ان رکاز سے پتہ چلتا ہے کہ "ہوموار یکٹس" Homo Erectus بھی ہمارے ماضی قریب

تک زندہ تھے لیکن وہ بہر حال ہماری ہی طرح کے انسان تھے نہ کہ ہم سے الگ مختلف طرح کے کوئی ذیلی نوع۔بس اتنا ہے کہ کسی وجہ سے وہ نسل ختم ہو گئی۔

آرکیک ہوموسیپین اور نیندر تھل آدمی("Archaic Homo Sapien and Nanderthal Man")

خیالی ارتقائی خاکے میں جدید انسان کے فوراًپہلے آرکیک ہوموکا نمبر آتا ہے۔جدید انسان اور "آرکیک ہومو" میں اتنا فرق ہے کہ ماہرین اسے بہت کم الفاظ میں بیان کر کے گزر جاتے ہیں۔کچھ محققین کے خیال میں اس نسل کے نمائندے آج بھی آسٹریلیا کے اصل باشندوں کی صورت میں موجود ہیں۔ "آرکیک ہوموسیپین" کی طرح آسٹریلیا کے ان باشندوں کی بھنوئیں بھی ابھری ہوئی اور کھوپڑی کا سائز نسبتاً چھوٹا ہے۔کچھ اور تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ ابھی حالیہ زمانے تک ایسے کچھ انسان "ہنگری اور اٹلی" کے کچھ دیہات میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ارتقاء دانوں نے "ہالینڈ" کی نیندر وادی سے ملنے والے ڈھانچوں کو نیندر تھل آدمی قرار دیا ہے۔ماہرین کا خیال ہے کہ جدید انسانوں میں بھی ان کی نسل موجود ہے۔ہونے والی دریافتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ راگ رنگ کے شوقین تھے اور اپنے مردے دفناتے تھے۔

در حقیقت نیندر تھل نسل کو بعض معاملات میں جدید انسانوں پر فوقیت حاصل تھی نہ صرف ان کی کھوپڑی کا حجم زیادہ تھا بلکہ ان کا جسم بھی زیادہ مضبوط اور قد کاٹھ نسبتاً بڑا تھا۔

ایک ماہر علم الابدان "ٹرنکاس"(Trinkaus) کے خیال میں:

"The bones of the lower-thall and the legs were stronger than the modern man. The bones discovered by them show that modern

humans could never have achieved such power. This was the same world of physical strength in their children and women".[20]

"نینڈر تھل کے دھڑ اور ٹانگوں کی ہڈیاں جدید انسان کے مقابلے میں زیادہ مضبوط تھیں۔ان کی دریافت ہونے والی ہڈیوں سے پتہ چلتا ہے کہ جدید انسان ایسی طاقت شائد کبھی حاصل نہ کر سکے۔ان کے بچوں اور خواتین میں بھی جسمانی طاقت کا یہی عالم تھا"۔

مختصر یہ کہ نینڈر تھل انسان "Nanderthal Man" بھی انسان کی ایک نسل تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے انسانوں میں ضم ہو گئی۔

ان تمام عوامل سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی ارتقاء کا منظر نامہ خود ارتقاء پسندوں کے تخیل کی پیداوار ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔انسان ہمیشہ سے انسان تھا اور بندر شروع ہی سے ہی ایک الگ نوع تھے اور آج بھی ہے۔

تخلیق کی حقیقت(Reality of Creation)

ہر میدان میں نظریہ ارتقاء کی ناکامی کے بعد خورد حیاتیات کے نامور محققین تخلیق کی حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔انہوں نے یہ ماننا شروع کر دیا ہے کہ ہر چیز کسی باشعور خالق نے تخلیق کی ہے اور یہ تخلیق ایک بہت ہی بڑی ارفع تخلیق کا ایک حصہ ہے۔یہ وہ حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔اس حقیقت تک پہنچنے والے سائنسدانوں نے کھلے ذہن کے ساتھ کام کیا ہے اور انہوں نے "Intelligent Design" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ان سائنسدانوں کے سر خیل" مائیکل جے بے"(Michal J.Behe)نے ایک خالق کے مطلق وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اس حقیقت سے انکار کرنے والوں پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"The work on real life at the level of the open and the financial has clearly and unambiguously declared its results. This conclusion is so important that it can be called the most important discovery of science without fear. The slogan of Ureka, or Paa, should be raised from 10,000 circles on this discovery".[21]

"خلیے اور مالیکیول کی سطح پر حقیقت حیات پر ہونے کام نے واضح طور پر اور غیر مبہم انداز میں اپنے نتائج کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ نتیجہ اتنا اہم ہے کہ اسے بلاخوف تردید تاریخِ سائنس کی سب سے اہم دریافت کہا جاسکتا ہے۔ اس دریافت پر دس ہزار حلقوں سے بیک وقت یوریکا یعنی پالیا پالیا کا نعرہ بلند ہونا چاہیئے"۔

لیکن کسی قسم کا کوئی جشن نہیں منایا گیا۔ اس کی بجائے خلیے کی پیچیدگی پر ایک پُر اسرار خاموشی اختیار کر لی گئی ہے۔ جب یہی معاملہ عامۃ الناس کے سامنے لایا جاتا ہے تو صورت حال قبول کرنے میں قدرِ دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اپنی اپنی جگہ پر طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ واضح طور پر اس صورت حال پر اپنا مثبت رویہ اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے لیئے صورت حال باعث اطمینان ہے۔ باالآخر سائنسی حلقے ان حقیقتوں کو قبول کرنے میں متامل کیوں ہیں۔ وہ زندگی کا شعوری تخلیق ہونا تسلیم کیوں نہیں کرنا چاہتے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شعوری تخلیق تسلیم کرنے کی صورت میں انہیں خدا کو بھی ماننا پڑے گا۔

آج بہت سے لوگوں کو شاید یہ خبر نہیں کہ خدا پر ایمان نہ لانے کی صورت میں انہیں متبادل میں جو کچھ ماننا پڑتا ہے وہ سائنس کے نام پر فقط مغالطہ انگیزی ہے۔ ایسے لوگ جو "خلق الانسان من علق" اللہ نے تمہیں لاشے سے پیدا کیا"[22] کو غیر سائنسی مانتے ہیں، یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پہلی جاندار چیز کروڑوں سال پہلے "تلچھٹ" اور بجلی چمکنے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مگر قرآنِ مجید میں رحمِ مادر

کے اندر اِنسانی وُجود کی تشکیل اور اُس کے اِرتقاء کے مختلف مرحلے بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ربِّ کائنات کا نظامِ ربوبیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ بطنِ مادر کے اندر بھی جلوہ فرما ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی زندگی کے نقطۂ آغاز سے لے کر اُس کی تکمیل اور تولد کے وقت تک پرورش کا ربانی نظام انسان کو مختلف تدرِیجی اور اِرتقائی مرحلوں میں سے گزار کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اِنسانی وُجود کی داخلی کائنات ہو یا عالمِ ہست و بود کی خارجی کائنات، ہر جگہ ایک ہی نظامِ ربوبیت یکساں شان اور نظم و اُصول کے ساتھ کارفرما ہے۔ قرآنِ مجید کے بیان کردہ اِن مراحلِ اِرتقاء کی تصدیق بھی آج کی جدید سائنسی تحقیق کے ذرِیعے ہو چکی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

1. وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ

اور بیشک ہم نے اِنسان کی تخلیق (کی اِبتدا) مٹی کے (کیمیائی اجزا کے) خلاصہ سے فرمائیo

2. ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ O

پھر ہم نے اُسے نطفہ (تولیدی قطرہ) بنا کر ایک مضبوط جگہ (رحمِ مادر) میں رکھاo

3. ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً.

پھر ہم نے اس نطفہ کو (رحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلّق وجود بنا دیا۔

4. فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً.

پھر ہم نے اُس معلّق وُجود کو ایک (ایسا) لوتھڑا بنا دیا جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے۔

5. فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا.

پھر ہم نے اُس لوتھڑے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا۔

6. فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا.

پھر ہم نے اُن ہڈیوں پر گوشت (اور پٹھے) چڑھائے۔

7. ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ [23]

"پھر ہم نے اُسے تخلیق کی دُوسری صورت میں (بدل کر تدرِیجاً) نشوونما دی، پھر (اُس) اللہ نے (اُسے) بڑھا کر محکم وُجود بنا دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہے"۔

ان آیات میں انسانی تشکیل و اِرتقاء کے سات مراحل کا ذِکر ہے۔ جن میں سے پہلے کا تعلق اُس کی کیمیائی تشکیل سے ہے اور بقیہ چھ کا اُس کے بطنِ مادر کے تشکیلی مراحل سے۔ مذکورہ بالا آیات میں بیان کردہ اِنسانی اِرتقاء کے مراحل (developmental stages of human embryo) درج ذیل ہیں:

سُلٰلۃ من طین Extract of clay

نطفہ Spermatic liquid of sperm

علقہ Hanging mass clinging to the endometrium of the uterus

مضغہ Chewed lump of chewed substance

عظام Skeletal system

لحم Muscular system

خلقِ آخر New creation

پھر اُس تخلیق میں باری تعالیٰ نے نظامِ سماعت کو نظامِ بصارت اور نظامِ عقل و فہم پر مقدّم رکھا ہے۔ اِرشاد فرمایا گیا:

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔ [24]

"پھر اُسے (اعضائے جسمانی کے تناسب سے) درُست کیا اور اُس میں اپنی طرف سے جان پھونکی اور تمہارے لئے (سننے اور دیکھنے کو) کان اور آنکھیں بنائیں اور (سوچنے سمجھنے کے لئے) دِماغ، مگر تم کم ہی (اِن نعمتوں کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھتے ہوئے) شکر بجالاتے ہو"۔

اِسی طرح ایک دُوسرے مقام پر اِرشادِ ربانی ہے:

اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا O[25]

"بیشک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے (mingled fluid) سے پیدا کیا۔ پھر ہم اُسے مختلف حالتوں میں پلٹتے اور جانچتے ہیں، حتیٰ کہ اُسے سننے والا (اور) دیکھنے والا (انسان) بنا دیتے ہیں"۔

یہاں بھی اِس امر کی بخوبی صراحت ہے کہ اِنسانی ایمبریو (embryo) کی نشوونما میں اِنسان کے نظامِ سماعت کو پہلے وُجود میں لایا جاتا ہے اور نظامِ بصارت بعد میں تشکیل پاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں درج اِس تخلیقی عمل کی تصریح اور تائید آج ایمبریالوجی (embryology) کی جدید تحقیق نے کر دی ہے۔ کینیڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی (University of Toronto) میں شعبۂ اناٹومی کے پروفیسر ڈاکٹر کیتھ ایل مُور (Dr Keith L. Moore) اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"Primordium of the internal ears appears before the beginning of the eyes and the brain (the site of understanding) differentiates last. This part of Sura 32: 9 indicates that special senses of hearing, seeing and feeling develop in this order, which is true".26

ترجمہ: ’’کانوں کے اندرونی عضوِیات آنکھوں کی اِبتدا سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر دِماغ (سمجھنے کی صلاحیت) اُسے ممتاز کرتی ہے۔ سورۃ السجدہ کی آیت نمبر 9 کا یہ حصہ اِس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مخصوص حسِ سامعہ، حسِ باصرہ اور حسِ لامسہ بالترتیب نمو پاتی ہیں، اور یہی حقیقت ہے‘‘۔

تخلیقِ انسانی کے بارے میں یہ وہ سائنسی حقائق ہیں جنہیں قرآنِ مجید آج سے چودہ سو سال پہلے منظرِ عام پر لایا اور آج جدید سائنس نے اُن کی تصدیق و تائید کر دی ہے۔ اِس سے باری تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کی عظمتوں اور رِفعتوں کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید کی حقانیت اور نبوتِ محمدی کی صداقت و قطعیت کی ایسی عقلی دلیل بھی میسر آتی ہے جس کا کوئی صاحبِ طبعِ سلیم اِنکار نہیں کر سکتا۔

بطنِ مادر میں اِنسان کے حیاتیاتی نشوونما کے یہ مدارج معلوم کرنے کا باقاعدہ سائنسی نظام سب سے پہلے 1941ء میں سٹریٹر (Streeter) نے اِیجاد کیا جو بعد ازاں 1972ء میں O' Rahilly کے تجویز کردہ نظام کے ذریعے زیادہ بہتر اور صحیح شکل میں بدلا گیا۔[27]

اب اِکیسویں صدی کے آغاز تک یہ نظام مرحلہ وار تحقیق کے بعد بھرپور مستحکم ہو چکا ہے، مگر قرآنِ مجید کا اِسی صحتِ ترتیب کے ساتھ آج سے 14 صدیاں قبل اِن مدارج کو بیان کرنا جس کی تصدیق آج اناٹومی اور ایمبریالوجی کی جدید تحقیقات کے ذریعے ہوئی ہے، ایک ناقابلِ اِنکار معجزہ ہے، جسے غیر مسلم دُنیا بھی اپنے تمام تر تعصبات کے باوُجود تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

جیسا کہ فطری عوامل تعداد میں اتنے زیادہ اور اتنے نازک طور پر متوازن ہیں کہ ان کا محض اتفاقاًیوں متشکل ہو جانے کو ماننا قطعی غیر عقلی طرز عمل ہو گا۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس غیر عقلی اور غیر منطقی طرز عمل سے نجات نہیں دلا سکتے کتنی ہی کوشش کیوں ہی نہ کریں زمین اور آسمانوں پر موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اللہ ہی نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور وہ سب کچھ بھی جو ان کے درمیان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کی نشانیاں پوری کائنات پر محیط ہیں۔

حوالہ جات:

[1]جوہر، محمد دین، الحاد، کتاب محل، لاہور، 2018، ص:120

[2]ہارون یحیٰ، کائنات، نظریہ، وقت اور تقدیر، انداز پبلشرز، راولپنڈی، 2003، ص6

[3]اینڈریو لینگے، اوکسفورڈ ابتدائی انسائیکلوپیڈیا سائنس اور ٹیکنالوجی، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2010، ص:56

[4]ہارون یحیٰ، نظریہ ارتقاء ایک فریب، انداز پبلشرز، راولپنڈی، 1998، ص:87

[5]*Charles Robert Darwin, The Origin of Species, Vintage Classics,UK, 2009,P:122*

[6]ہارون یحیٰ، جب زندگی شروع ہوئی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 2012، ص:34

[7]*Charles Robert Darwin, The Origin of Species,P:82*

[8]*Derck V Ager,The Evolution of life history,Capman & hall publishing,Uk,1992,P:98*

[9]ہارون یحیٰ، نظریہ وقت اور تقدیر، انداز پبلشرز، راولپنڈی، 2003 ,ص۔84

[10]*Richard Monestarsky, Earth Science,New Yark times books,1999,P:117*

[11]*Stephan Bengston,Family Theory and Research,Sage Publishers,New Dehli,2005,P:211*

[12]*Earnest A.Hutton,The Evolution,New Yark Press,1977,P:153*

[13]ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، فکشن ہاؤس مزنگ، لاہور، 2014، ص:143

Henry Fairfield,Evolution and Religion,C.Scribner's son,1923,Page:15[14]

[15]*Charles Robert Darwin, The Origin of Species,Page:82*

[16]غیاث چوہدری، کائنات اور ہم، ٹیکنیکل پبلیشرز، لاہور، 1994، ص:55

[17] ہارون یحیٰ، نظریہ ارتقاء ایک دھوکہ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 2012ص:87

Fred Spoon,Evolving Primates,University van Ambsterdam Press,2006,P:42[18]

[19]*Rechard Leakey,The Origin of Humankind,Orion Press,213,Page:120*

[20] Erik Trinkaus,The Shanidar Neandertal,Elsevier Sciences,2014,P:295

[21] ہارون یحیٰ، خلیہ ایک اکائی،(مترجم: عبد الخالق ہمدرد) مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 2007، ص:40

[22] العلق2:92

[23] المومنون، 23 : 14-12

[24] السجدہ، 32 : 9

[25] الدھر، 76 : 2

[26] Keith L.Moore,Developing Human,Elsevier Press,2015,P:241

[27] . Moore, K.L, The Developing Human Clinically Oriented Embryology, 3rd ed. Philadelphia, W.B. Sanders Co., 1982.P:241